۱۶۱

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

مضامینِ اقبالؒ کا عمرانی مُطالعہ

ڈاکٹر صدیق جاوید

مضامینِ اقبال کا عمرانی مطالعہ

ڈاکٹر جاوید اقبال

اقبالیات میں ایک اہم بحث یہ چلی آ رہی ہے کہ اقبال شاعر ہے یا فلسفی؟ اگر بیک وقت اس کی دونوں حیثیتیں ہیں تو ہم اسے فلسفی شاعر کہیں یا شاعر فلسفی؟

اس بحث کے شرکا کی اکثریت اس نتیجہ پر متفق نظر آتی ہے کہ وہ فلسفی شاعر تھے۔ اس کی تائید اس امر سے ہوتی ہے کہ اقبال نے دنیا کے اکثر فلسفی شعرا کی طرح نظم کے ساتھ ساتھ نثر کو بھی اپنی فکر کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ایسے شعرا کے نثری مضامین اور مکاتیب وغیرہ ان کی منظومات کی تفسیر اور مدلل حواشی ہوتے ہیں۔

علامہ اقبال کا سب سے پہلا مضمون:

'The Doctrine of Absolute Unity as Expounded" by Abdul Karim al-Jilani

رسالہ 'انڈین اینٹی کیوری' بمبئی کے شمارہ ستمبر ۱۹۰۰ء میں شائع ہوا۔ اس مضمون کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ اس مضمون کا ایک بڑا حصہ اقبال نے اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالہ میں شامل کیا۔

اسی طرح اقبال کا مضمون (مطبوعہ مخزن جنوری ۱۹۰۲ء) بعنوان 'بچوں کی تعلیم و تربیت'، بظاہر یہ عنوان عام اور پامال ہے لیکن بغور مطالعہ کے بعد اسے اقبال کے فکر کا نقطۂ آغاز قرار دیا جا سکتا ہے۔[1] اسی طرح اقبال کی پہلی کتاب ۱۹۰۴ء میں "علم الاقتصاد" کے نام سے شائع ہوئی۔ اس کا بھی دقتِ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو اس تصنیف میں اقبال کے عمرانی افکار کی بنیادیں تلاش کی جا سکتی ہیں۔[2]

ان تحریروں کے علاوہ ۱۹۱۴ء (گویا اسرارِ خودی کی تخلیق) تک اقبال کے قابلِ ذکر مقالات کی ترتیب اور تاریخِ اشاعت حسبِ ذیل ہے:

۱۔ قومی زندگی : مخزن اکتوبر ۱۹۰۴ء و مارچ ۱۹۰۵ء

۲۔ دو خط بنام ایڈیٹر وطن لاہور ۱۹۰۵ء

۳۔ The Development of Metaphysics in Persia 1908.

۴۔ خلافتِ اسلامیہ (ترجمہ) ۱۹۰۸ء Political thought in Islam

۵۔ Islam as a Moral and Political Ideal 1909

۶۔ Muslim Community (a sociological study 1910)

یہاں متذکرہ مقالات کے انفرادی جائزے کے بجائے ان کا مجموعی مطالعہ کیا جائے گا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ "قومی زندگی" میں اسبق کے مقالے (بچوں کی تعلیم و تربیت) اور "علم الاقتصاد" میں اقبال کے جو عمرانی خیالات بالواسطہ اور ضمنی طور پر بیان ہوئے ہیں، وہ "قومی زندگی" میں باقاعدہ موضوعِ بحث کی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے مقالات میں بھی کم و بیش یہی عمرانی مسائل زیرِ بحث آتے ہیں۔

ہندوستان میں انیسویں صدی کے نصف آخر میں قومی ترقی کا مسئلہ اہلِ فکر و نظر کی خصوصی توجہ کا مرکز تھا اور عام طور پر ترقی کو معاشرتی اصلاح سے وابستہ خیال کیا جاتا تھا۔ البتہ نسبتاً وسیع النظر اور سرگرم مصلحین کی کوششیں سماجی و معاشرتی اور تعلیمی و تجارتی اصلاحات کا بھی احاطہ کرتی ہیں۔

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں برصغیر کا نیا تعلیم یافتہ طبقہ جدید تعلیم اور جدید ذرائع رسل و رسائل کے اثرات کی وجہ سے مغربی اقوام کی تیز رفتار علمی اور تمدنی ترقیوں کو بچشمِ حیرت دیکھ رہا تھا۔ ان میں سے چند باشعور اور اہلِ بصیرت دردمند افراد نے جب مغرب کی ان علمی اور تمدنی ترقیوں کے نتائج و مواقب کا تاریخی شعور کی روشنی میں دقتِ نظر سے جائزہ لیا تو انہیں اپنی قومی زندگی کا وجود خطرے میں نظر آیا بلکہ قوم کی بقا بھی مخدوش اور مشکوک دکھائی دی۔

اس صورتِ حال کے پیشِ نظر قومی تحفظ کے لیے مختلف لوگوں نے مختلف تدابیر اور تجاویز پیش کیں۔ ان میں عام طور پر اصلاحِ معاشرت کی تحریک، حصولِ تعلیم کے لیے اداروں کا قیام اور سیاسی حقوق و مراعات کے لیے سیاسی و نیم سیاسی جماعتوں کی تنظیم کو انقلابی قدم سمجھا گیا مگر اقبال نے اپنی علمی بصیرت اور تاریخی شعور کی بدولت قومی بقا اور احیا کے ضمن میں قدرت کے نظام اور اس کے اصولوں کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اقبال فلسفہ، تاریخ، ادب، مذہب اور اس حوالے سے سماجیات اور عمرانیات کے ایک زیرک طالب علم تھے۔ انھوں نے تہذیبوں اور قوموں کے عروج و زوال کے تاریخی مطالعے سے ان اسباب کا سراغ لگانے کی کوشش کی جو قدیم قوموں اور تہذیبوں کی ہلاکت کا باعث بنے۔

اس تلاش میں اقبال کی نظر ڈارون کے نظریہ "تنازع للبقا" پر آکر ٹھہرتی ہے۔ اقبال نے اس نظریے کی علمی صداقت اور عالمگیریت کو ذہنی اور عقلی سطح پر قبول کر لیا تھا۔ جب بھی ضرورت ہوتی ہے، وہ اسی نظریے کے حوالے سے افراد، قوموں اور تہذیبوں کی بقا و فنا کا جائزہ لیتے ہیں۔ انہوں نے "علم الاقتصاد" میں انسانی ارتقا کا تذکرہ کرتے ہوئے بھی اس نظریے کو حوالہ بنایا تھا۔ اقبال اپنے مضمون "قومی زندگی" میں "تنازع للبقا" کے اصول کو قوموں پر منطبق کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "واقعاتِ عالم کے مشاہدے سے حکما اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ زندگی کی مختلف صورتوں یعنی انسانوں، حیوانوں، پودوں وغیرہ میں ایک قسم کی جنگ جاری رہتی ہے..... اس کشمکشِ حیات میں کامیاب ہونے کے لیے ہر طبقۂ زندگی معروف رہتا ہے لیکن فتح صرف اسی طبقے کو حاصل ہوتی ہے جس میں رہنے کی قابلیت ہو یعنی جس نے زندگی کے متغیر حالات سے موافقت پیدا کر لی ہو..... صدہا قومیں پیدا ہوئیں، پھلیں پھولیں اور آخر کار اس اٹل قانون کے عمل سے متاثر ہو کر خاک میں مل گئیں۔"[36]

اس قانون سے اقبال نے یہ نکتہ اخذ کیا ہے کہ کائنات میں مسلسل ارتقا کا عمل جاری ہے۔ وہ کہتے ہیں

> "اب زمانہ ایک بڑے انقلاب سے گزر چکا ہے۔ اب مصافِ ہستی میں اقوام کی فتح و کامیابی کا انحصار تلوار اور افرادی طاقت پر نہیں رہا۔ اس کی جگہ علوم اور ایجادات کی روز افزوں ترقیوں نے لے لی ہے۔ اب وہی اقوام غلبہ اور تسلط حاصل کریں گی گویا زندہ رہیں گی، جو کشمکشِ حیات میں نئے وسائل پر دسترس رکھتی ہوں گی۔ اس قانون کے مطابق اقوام و ملل کی طرح دوسرے تہذیبی مظاہر اور عناصر معدوم ہو جاتے ہیں۔ مثلاً کئی زبانوں کی "موت کا راز" اسی قانون کا عمل ہے"[37]

حتیٰ کہ "سینکڑوں مذاہب دنیا میں پیدا ہوئے۔ بڑھے، پھولے پھلے اور آخر کار مٹ گئے، کیوں؟ اس کی وجہ یہی ہے کہ انسان کے عقلی ارتقا کے ساتھ ساتھ جدید ضروریات پیدا ہوتی گئیں..... جن کو ان مذاہب کے اصول پورا نہ کر سکے۔ یہی سبب ہے کہ اہلِ مذہب کو وقتاً فوقتاً نئے نئے علمِ کلام ایجاد کرنے کی ضرورت پیش آتی رہی جن کے اصول کی رو سے انہوں نے اپنے اپنے

مذاہب کو پرکھا اور ان کی تعلیم کو ایسی صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی جو
عملی اور روحانی زندگی میں انسان کی راہ نما ہو سکے۔"[۸]

"ملّتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر" علامہ اقبال کا ایک مشہور خطبہ ہے جو دسمبر ۱۹۱۰ء کو انھوں نے سٹریچی ہال علی گڑھ میں دیا تھا۔[۹]

یہ خطبہ اقبال نے بڑے خطیبانہ انداز میں پیش کیا ہے، وہ یہاں بھی ڈارون کے اصولِ ارتقا سے متاثر دکھائی دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ تاریخ شاہد ہے کہ انسانی ارتقا کے دوران قومیں، سلطنتیں اور تہذیبیں نیست و نابود ہو گئیں۔ کیونکہ:

"قدرت کی قوتوں کی نظروں میں نہ افراد کی وقعت ہے نہ اقوام کی منزلت
اس کے اٹل قوانین برابر اپنا عمل کیے جا رہے ہیں . . . . ."[۱۰]

مگر یہ انسان کی عظمت ہے کہ وہ ایک کمزور مخلوق ہوتے ہوئے بھی قدرت کے روح فرسا مظاہر اور حوصلہ شکن حالات کے مقابل انسانی ارتقا کے لیے کوشاں رہا۔ اس سے اقبال کی آزادانہ فکر کا اندازہ ہوتا ہے انھوں نے ڈارون کے نظریۂ ارتقا سے بے حد متاثر ہونے کے باوجود اس نظریے کے سیاسی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا۔

"قومی زندگی" میں اقبال نے سوال اٹھایا تھا:

"کیا قوم کی زندگی قوم کے اختیار میں ہے یا پودوں اور حیوانوں کی طرح
افراد انسانی کی زندگی بھی قوائے فطرت کے غیر اختیاری عمل پر منحصر ہے؟ اگرچہ
زندگی کی اصلیت مخلوقات کی صورت میں وہی ہے، تاہم انسان اپنی عقلِ خداداد
کی وجہ سے . . . . قدرت کے قوانین کو معلوم کر کے ان سے فائدہ اٹھا سکتا
ہے اور اپنے ارتقا کے رخ کو متعین کر سکتا ہے۔"[۱۱]

بہر حال اقبال کے نزدیک ڈارون کے قانونِ انتخابِ فطری نے انسان کو تاریخی شعور بخشا ہے۔ اس قانون کی معنویت پر گہری نظر اور ڈارون کے دبستان کے فلسفیوں کے حیاتِ اجتماعی کے ایسے ہی اہم حقائق کی دریافت سے

"مدنی زندگی کے عمرانی، اخلاقی، اقتصادی اور سیاسی پہلوؤں کے متعلق
انسان کے تصورات میں ایک انقلابِ عظیم پیدا ہونے کی صورت نکل آئی۔"[۱۲]

لہٰذا ان تصورات کو راہ نما بنا کر انسان نے تمدنی ارتقا کی منازل طے کیں۔ اس تمدنی جہد للبقا میں دوسری اقوام کے مقابل مسلمان خاطر خواہ طاقت اور صلاحیت کے مالک ہیں یا نہیں؟ اقبال نے اس سوال پر غور کیا ہے، کیونکہ اس سوال کے جواب سے ہندوستان کے مسلمانوں کی قومی ہستی کے استحکام کا تصور قائم ہو گا۔ اقبال "قومی زندگی" میں جاپان کے

صنعتی انقلاب اور تمدنی ترقی کو اقوامِ ہند کے لیے نمونہ قرار دیتے ہوئے مسلمانوں کے منفعل رویے کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اقوامِ ہند میں سے ہمارے بھائیوں نے اس (ترقی کے) راز کو کسی قدر سمجھا ہے۔ . . . . اس واسطے یقیناً ان کے سامنے ترقی کا ایک وسیع میدان ہے لیکن مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اگر اس اعتبار سے مسلمانوں کو دیکھا جائے تو ان کی حالت نہایت مخدوش نظر آتی ہے۔ یہ بدقسمت قوم حکومت کھو بیٹھی ہے، صنعت کھو بیٹھی ہے، تجارت کھو بیٹھی ہے۔ اب وقت کے تقاضوں سے غافل اور افلاس کی تیز تلوار سے مجروح ہو کر ایک بے معنی توکل کا عصا ٹیکے کھڑی ہے اور باتیں تو خیر، ابھی تک ان کے مذہبی نزاعوں کا بھی فیصلہ نہیں ہوا۔"[۱]

کسی قوم کی معاشی خوشحالی اور اقتصادی ترقی محض ایک مادی مسئلہ نہیں ہے اور نہ صرف قومی عزّ و وقار کا مسئلہ ہے بلکہ قومی بقا کا مسئلہ ہے۔ لہٰذا معاشی بدحالی اور افلاس جس طرح ایک فرد کے اعصاب کو مضمحل کرتا ہے اسی طرح عمرانی نظام کو درہم برہم کر کے جرائم کا جواز فراہم کرتا ہے۔ وہ الگ عمرانی مسائل ہیں اور انھیں عمرانیات میں معاشرتی امراض قرار دیا گیا ہے مگر یہ قائم بالذات حقیقت ہے کہ تمدنی تقاضوں سے تغافل برتنے کا عمل قوم کے مستقبل کو تاریک بناتا ہے۔ لہٰذا نئی نسل کی تولید، اس کی تعلیم و تربیت اور پرورش کا مطلب ہے کہ تمدنی تقاضوں سے باخبر قوم "قانونِ بقائے افرادِ قویہ" کا احترام کرتی ہے۔ اس لیے ایسی قوم کا تسلسلِ حیات برقرار رہتا ہے۔ گویا عمرانی اقدار اور تقاضوں کے مطابق پرورش پانے والی اقوام کی نئی نسل پر ان کی قومی بقا کا انحصار ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے مختلف علوم نے ثابت کیا ہے۔ مثلاً "علم الاقتصاد" میں اقبال نے ایک جگہ لکھا ہے:

"انسان کی آبادی دن بدن بڑھتی جاتی ہے اور تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ اس کی ضروریات بھی بڑھتی جاتی ہیں لہٰذا اگر وہ صرف قدرتی اسباب کی پیدائش کے بھروسہ پر رہتا اور اپنی روز افزوں ضروریات کے پورا کرنے کی نئی نئی راہیں نہ نکالتا یا بالفاظِ دیگر یوں کہو کہ اپنی عقل کے زور سے قانونِ تقلیلِ حاصل کے اثر کا مقابلہ نہ کرتا تو اس امن و آسائش میں انتہا درجہ کا خلل پیدا ہو جاتا بلکہ اس کی نسل کا بقا ہی محال ہو جاتا۔"[۲]

اقبال نے قومی ہستی کے تسلسل کے لیے نئی نسلوں کی بہبودی کو ایک تاریخی تقاضا قرار دیا ہے۔ وہ "قومی زندگی" کے آغاز میں لکھتے ہیں:

"قوموں کی تاریخ میں یہ ایک بڑا نازک وقت ہے جو اس بات کا متقاضی ہے کہ ہر قوم نہ صرف اپنی موجودہ حالت پر غور کرے بلکہ اگر اسے اقوامِ عالم کے دفتر میں اپنا نام قائم رکھنا ہے تو اپنی آئندہ نسلوں کی بہبودی کو بھی ایک موجودہ واقعہ تصور کرے اور ایسا طریق عمل اختیار کرے جس کے احاطۂ اثر میں اس کے اخلاف کا تمدن بھی شامل ہو۔"[۱۵]

اقبال اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ اب معروضی حالات بدل گئے ہیں نئے تمدنی تقاضے اور ضروریات میں تغیر آ گیا ہے۔ لہٰذا جدید علوم و فنون کے اکتساب کے بغیر کوئی قوم نہ خود ترقی یافتہ اقوام کا مقابلہ کر سکتی ہے اور نہ اس کی آئندہ نسلیں زندگی کی کشمکش میں کامیاب ہو سکتی ہیں۔ بریفالٹ نے بھی "تشکیلِ انسانیت" میں لکھا ہے:

"جس طرح ہم گزشتہ نسلوں کی پیداوار ہیں اسی طرح ہم نسلِ انسانی کے آئندہ ارتقا کے معمار بھی ہیں۔ جس طرح ماضی کا یہ وظیفہ تھا کہ ہمیں وہ کچھ بنا دے جو ہم ہیں، اسی طرح مستقبل بھی ہمارے وجود اور عمل پر منحصر ہے۔"[۱۶]

اقبال نے ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر" میں زیرِ نظر مسئلہ کا بڑی گہری نظر سے جائزہ لیا ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک اس مسئلہ کو نظر انداز کر کے تمدنی، اخلاقی اور سیاسی اصلاح کی کوئی کوشش بار آور نہیں ہو سکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہنگامی اغراض کے پیشِ نظر جو لائحہ عمل مرتب کیا جاتا ہے، وہ دور رس اثرات کا حامل نہیں ہوتا اور بسا اوقات روبہ عمل آنے سے پیشتر ہی منتشر ہو جاتا ہے۔ اقبال نے اس خطبہ میں ایک ایسی خیال انگیز بات پیش کی ہے جس کو عمرانی فکر و عمل کا محور قرار دینا چاہیے۔ اُن کے مطابق:

"..... یہ خیال کہ ..... (قوم) اپنے افراد کا محض ایک مجموعہ ہے، اصولاً غلط ہے ..... اس کی ماہیت پر اگر نظرِ غائر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ غیر محدود اور لامتناہی ہے، اس لیے کہ اس کے اجزائے ترکیبی میں وہ کثیر التعداد آنے والی نسلیں بھی شامل ہیں جو اگرچہ عمرانی حدِ نظر کے فوری منتہا کے پرلی طرف واقع ہیں لیکن ایک زندہ جماعت کا سب سے زیادہ اہم جزو متصور ہونے کے قابل ہیں۔ علم الحیات کے اکتشافاتِ جدیدہ نے اس

حقیقت کے چہرے پر سے پردہ اٹھایا ہے کہ کامیاب حیوانی جماعتوں کا حال ہمیشہ استقبال کے تابع ہوتا ہے۔ . . . . موجودہ افراد کی فوری اغراض ان غیر محدود اور نامشہود افراد کی اغراض کے تابع بلکہ ان پر نثار کر دی جاتی ہیں جو نسلاً بعد نسلٍ بتدریج ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔"[۱۲]

یہ اقتباس بہت گہری عمرانی معنویت کا حامل ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ قوموں کے سماجی، تمدنی اور تہذیبی مقاصد بالفاظِ دیگر عمرانی نصب العین ان کے رویے اور طرزِ عمل یا اسلوبِ زیست کا تعین کرتا ہے۔ کیونکہ اسی نصب العین پر ہی کسی قوم کے تسلسلِ حیات کا دار و مدار ہوتا ہے۔ اقبال نے اس رمز کو بڑے عمدہ الفاظ میں ادا کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اگر غور سے دیکھا جائے تو اقوام کے لیے سب سے زیادہ مہتم بالشان عقدہ فقط یہ عقدہ ہے (خواہ اس کی نوعیت تمدنی قرار دی جائے خواہ اقتصادی خواہ سیاسی) کہ قومی ہستی کا سلسلہ بلا انقطاع کس طرح قائم رکھا جائے ــــ مٹنے یا معدوم ہونے کے خیال سے قومیں بھی ویسی ہی خائف ہیں جیسے افراد. . . ."[۱۳]

معافِ ہستی ایک عالمگیر اور اٹل قانون ہے۔ ایسے افراد یا اقوام کی خواہشات سے سروکار نہیں ہوتا اقبال نے "قومی زندگی" میں بڑا معنی خیز سوال اٹھایا ہے۔ ان کے مطابق، ہو سکتا ہے، کسی قوم کے افراد کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہو کہ وہ قوم کی آیندہ بہبودی یا بقا کے لیے اپنا آرام و سکون یا زندگی کیوں قربان کریں؟ اقبال لکھتے ہیں کہ:

". . . . . (اس) کا کوئی منطقی جواب ہمارے پاس نہیں ہے لیکن اس خطرناک شبہ کے وقت مذہب اپنی دستگیری کرتا ہے اور ہمیں بتاتا ہے کہ ایثار یعنی اوروں کے نفع کو اپنے ذاتی نفع پر مقدم رکھنے کی بنا عقل نہیں ہے بلکہ یہ نیکی جو ارتقائے نوعِ انسانی اور قوم کے لیے سخت ضروری ہے، ایک فوق العادت اصول پر مبنی ہے۔ . . . . آوازِ نبوت کا اصلی زور اور اس کی حقیقی وقعت عقلی دلائل اور براہین پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس کا دار و مدار اُس روحانی مشاہدے پر ہے جو نبی کے غیر معمولی قوا کو حاصل ہوتا ہے اور جس کی بنا پر اس کی آواز میں وہ ربانی سطوت و جبروت پیدا ہو جاتا ہے جس کے سامنے انسانی شوکت ہیچِ محض ہے، یہ ہے نمودِ مذہب کا اصلی راز. . . ."

باریک بین لوگ جانتے ہیں کہ اگر قبائلِ انسانی کو ایثار کی تعلیم نہ دی جاتی تو یقیناً ارتقائے انسانی کا سلسلہ ٹوٹ جاتا اور موجودہ تہذیب و تمدن کی وہ صورت مطلق نہ ہوتی جو آج ہے۔ . . . .[15]"

ارتقائے انسانی میں مذہب کا صرف اس قدر ہی کردار نہیں ہے کہ اس نے انسانی تمدن کے تسلسل کو برقرار رکھنے میں مدد کی۔ بقول اقبال:

". . . . بلکہ اس کی اصلی غایت یہ ہے کہ زندگی کی سطح کو بتدریج بلند کرنے کے لیے ایک مربوط اور متناسب عمرانی نظام قائم کیا جائے۔ مذہب، سیرتِ انسانی کا ایک نیا اسلوب یا نمونہ پیدا کرکے اس شخص کے اثر کے لحاظ سے جو اس سیرت کا مظہر ہے، اس نمونے کو دنیا میں پھیلانا چاہتا ہے۔[16]"

اس سیرت کا اکمل نمونہ تو صرف نبی کی ذات ہی ہوتی ہے۔ اقبال نے اپنے مقالہ Islam as a Moral and Political Ideal' میں ایک جگہ لکھا ہے:

". . . when I say that the religion of a people is the sum total of their life experience finding a definite expression through the medium of a great personality, I am only translating the fact of revelation into the language of science"

یہاں اقبال نے مذہب کے قیام اور اس کی تبلیغ کی ذمہ دار شخصیت کا عمومی اصول مذہب کی رُو سے علمی زبان میں بیان کیا ہے۔ آئندہ سطور میں اسلام اور بانیٔ اسلام کا ذکر مبارک جس پیرائے میں کیا ہے، اس سے اسلام کی حقانیت اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت پر ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"Islam is moreover the youngest of all religions, the last creation of humanity. Its founder stands out clear before us; he is truly a personage of history and lends himself freely even to the most searching criticism. Ingenious legend has weaved no screens round his figure; he is horn in the broad day-light of history; we can thoroughly understand the inner spring of his actions; we can subject his mind to a keen psychological analysis."

اقبال نے "قومی زندگی" اور "اسلام بطور ایک اخلاقی اور سیاسی نصب العین" میں اسلامی مساوات کی عمرانی، سیاسی اور اخلاقی قدر کو واضح کیا ہے۔ غلامی کے ادارے کو جو صدیوں تک انسانی تمدن کا ایک لازمی حصہ خیال کیا جاتا تھا، رسولِ اکرمؐ نے منسوخ فرما دیا اور بقول اقبال:

. . . . . غلاموں اور آقاؤں کے حقوق کو مساوی قرار دے کر اس تمدنی انقلاب کی بنیاد رکھی جس کے نتائج کو اس وقت تمام دنیا محسوس کر رہی ہے۔[۲۵]

تمدنِ انسانی کی تاریخ میں سیاسی، عمرانی اور اخلاقی حوالے سے اسلام جو سب سے بڑا انقلاب لایا، اس کا ایک پہلو تو انسانی ضمیر کی آزادی ہے۔ اسلام نے انسان کو قیدِ مقامی یعنی تصورِ وطن سے نجات دلائی۔ اسلام میں قومیت کا تصور بھی محدود نہیں بلکہ دوسری اقوام سے بنیادی طور پر مختلف ہے، جیسا کہ اقبال لکھتے ہیں:

"Nationality with us a pure idea; it has no geographical basis. But in as much as the average man demands a material centre of nationality, the Muslim looks for it in the town of Mecca, so that the basis of Muslim nationality combines the real and the ideal, the concrete and the abstract"

چونکہ اسلام ایک ملتِ واحدہ ہے اس لیے اسلامی قومیت کی بنیاد رنگ، خون، نسل یا وطن نہیں ہے۔ اقبال نے اس خیال کا اظہار بار بار اپنی نظموں میں بھی کیا ہے اور "ملتِ بیضا پر عمرانی نظر" اور "اسلام کا اخلاقی و سیاسی نصب العین" میں اسلامی قومیت کے تصور پر اور اس کی شرائط پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور کہا ہے کہ اسلام محض مذہب یا عقیدہ کا نام نہیں ہے۔ اسلام ایک معاشرہ اور قوم بھی ہے۔[۲۶]

"غرض مذہبی خیال، بلا اس دینی اکتناز Theological Centralisations کے جو افراد کی آزادی میں غیر ضروری طور پر خلل انداز ہو، اسلامی جماعت کی ہیئتِ ترکیبی کا مدار علیہ ہے۔"[۲۷]

خطبہ علی گڑھ میں اقبال نے ایک اور اہم عمرانی پہلو پر اظہارِ خیال کیا ہے، جسے عمرانیات میں ثقافت سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ثقافت کو اقوام کی شناخت کا ایک وسیلہ اور تشخص کا ایک ذریعہ خیال کیا گیا ہے۔ کسی قوم کی تمدنی و تہذیبی روایات اور رسوم و رواج گویا معتقدات و توہماتِ افراد پر جس طرح موثر ہوتے ہیں اور جس طرح معاشرہ میں ان کا اظہار ہوتا ہے، انہیں قومی ثقافت کہا جاتا ہے۔ جغرافیائی تصورِ وطن کی طرح علیحدہ قومی ثقافتیں بھی اسلام کے الٰہیاتی اصولِ وحدت سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ اقبال نے ثقافت کی بحث میں لکھا ہے:

"معتقداتِ مذہبی کی وحدت جس پر ہماری قومی زندگی کا دارومدار ہے، اگر مضاف سے تعبیر کی جائے تو اسلامی تہذیب کی یک رنگی بمنزلہ اس کے

مضاف الیہ کے ہے۔ محض اسلام پر ایمان لے آنا، اگرچہ نہایت ہی ضروری ہے لیکن کافی و مکتفی نہیں ہے۔ قومی ہستی میں شریک ہونے کی غرض سے ہر فرد کے لیے قلبِ ماہیت لازمی ہے اور اس قلبِ ماہیت کے لیے خارجی طور پر تو ارکان و قوانینِ اسلام کی پابندی کرنی چاہیے اور اندرونی طور پر اس یک رنگ تہذیب و شائستگی (Uniform culture) سے استفادہ کرنا چاہیے جو ہمارے آباؤ اجداد کی متفقہ عقلی تحریک کا ماحصل ہے۔"[28]

اسلام کی ثقافتی تاریخ میں اور علم و حکمت کے میدان میں مسلمانوں کے دوسرے کارناموں کے علاوہ نظامِ فقہ کی تدوین کو اقبال "اسلامی تمدن کا . . . . سب سے گراں مایہ ترکہ"[29] خیال کرتے ہیں:

اقبال نے قومی بقا و فنا کے اسباب پر سب سے زیادہ غور کیا ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کے فکر و نظر کا یہی مسئلہ محرک ہے۔ انہیں ڈاروِن کے نظریہ تنازع للبقا (مصافِ ہستی) اور بقائے اصلح (بقائے افرادِ قویہ) کی صداقت کا، علمی و عقلی سطح اور تاریخی شواہد کی بنا پر یقین ہے۔ انہوں نے قدیم اقوام میں سے مصری، یونانی اور افریقہ کی بربر قوموں کی ہستی کو بطور مثال پیش کرتے ہوئے، دراصل، ڈاروِن کے نظریہ کو ایک اٹل قانون بنایا ہے۔[30] اس سے اقبال نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ جن اقوام اور مذاہب نے زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں سے مطابقت پیدا کرنے کے لیے اصول وضع نہیں کیے، وہ اقوام اور مذاہب جمود کا شکار ہو کر زندگی کے میدان سے خارج ہو گئے۔ اسلام میں ہر دور کے عمرانی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے فقہ کے اصول اور قوانین موجود ہیں مگر ان اصولوں کو وقت کی "جدید روحانی اور جسمانی ضروریات"[31] سے مطابقت دے کر انہیں روبہ عمل لانے کی قوت و صلاحیت سے محرومی نے زوال اور انحطاط مسلمانوں کا مقدر بنا دیا ہے۔ اس لیے وہ موجودہ حالات میں سمجھتے ہیں کہ جدید تمدنی تقاضوں کی تفسیر و تعبیر کے لیے ایک زبردست فقیہ کی ضرورت ہے۔ علاوہ ازیں اقبال عظیم شخصیات کو بھی تاریخ کا ایک فطری تقاضا خیال کرتے ہیں۔ اور یہ خیال زیرِ نظر مضامین میں مختلف تناظر میں کئی بار آیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں:

"The ethical training of humanity is really the work of great personalities, who appear time to time during the course of human history."

بہرحال اقبال نے اپنے مضمون میں اسلام کے اخلاقی نصب العین پر خاصی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

اس کے بنیادی قضایا propositions دو ہیں:

ایک، خدا کائنات کی ہر چیز کا مالک ہے۔

دوسرے انسان اس کا خلیفہ ہے۔

اسی طرح اقبال نے مسلم معاشرے کے سیاسی دستور کے دو بنیادی تقاضا یا قرار دیے ہیں یعنی:

۱۔ قانونِ الٰہی مطلقاً اعلیٰ ہے اور؛

۲۔ اسلام میں جماعت کے تمام افراد مطلق مساوات رکھتے ہیں۔[43]

اسلام کے سیاسی تصورات ہی کے ضمن میں اقبال نے ۱۹۰۸ء میں ایک مضمون لکھا تھا۔ اس مضمون کے بارے میں اقبال کی نثر کے مرتبین اور بعض محققین واضح نہیں ہیں۔ وہ عام طور پر مبہم پیرایہ اختیار کرتے ہیں۔ اتفاق سے اس سلسلے کی ساری تفصیل فوق کے نام اقبال کے ایک خط میں موجود ہے۔ ۱۹؍ دسمبر ۱۹۲۲ء میں انہیں لکھتے ہیں:

"۔۔۔۔ اسلام میں سیاست" ۲۰ سال ہوئے انگریزی زبان میں لکھا گیا تھا یعنی ۱۹۰۸ء میں جب ترکی میں انقلاب ہو رہا تھا۔۔۔۔ یہ مضمون لندن کے سوشیالوجیکل ریویو میں شائع ہوا تھا۔ پیسہ اخبار نے اس کا ترجمہ بہت غلط شائع کیا ہے۔ صحیح ترجمہ زمیندار میں شائع ہوا تھا۔ یہ ترجمہ چودھری محمد حسین صاحب۔۔۔۔ نے کیا تھا معتبر ہے۔۔۔۔۔ انگریزی اصل چند روز ہوئے مسلم آؤٹ لک میں چھپا تھا۔۔۔۔"

"انوارِ اقبال" کے وضاحتی فٹ نوٹ کے مطابق:

"یہ مضمون "خلافتِ اسلامیہ" کے نام سے محمد دین فوق نے۔۔۔۔ ۱۹۲۰ء میں شائع کر دیا تھا"۔

اس فوٹ میں سال کے نمبر میں اکائی کا ہندسہ روشن نہیں۔[44] کتابچہ "خلافتِ اسلامیہ" شائع کردہ ظفر برادرس لاہور[45] سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتابچہ ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا تھا۔ چونکہ اس مضمون کے نکات بیان کرنے کے لیے اجمال و اختصار کے باوجود طوالت آ جائے گی، لہٰذا یہاں اس مضمون کا بنیادی خیال درج کیا جاتا ہے۔ اقبال زیرِ نظر مضمون کے ذیلی عنوان "اسلام و دستورِ انتخابِ خلیفہ" میں ایک بحث کے بعد لکھتے ہیں:

"نتیجہ یہ نکلا کہ مذہبِ اسلام میں مسئلہ "قانون سازی" کی بنیاد شریعت کے تصریحی احکام کے بعد تمام تر اتحاد و اتفاق و آرائے جمہورِ ملت کے بنیادی اصول پر قائم ہے"۔[46]

آخر میں زیرِ مطالعہ مضامین کی اس خصوصیت کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے کہ متذکرہ مضامین کے مختلف

www.IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved

صفحات پر فرد اور جماعت کے بارے میں اقبال کے ایسے خیالات ملتے ہیں جو بعد میں اقبال کے ہاں ایک باقاعدہ نظریہ کی شکل میں منظم و منضبط ہوئے اور آگے چل کر "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بیخودی" کی شکل میں منصۂ شہود پر آئے۔ متذکرہ مضامین کے بیسیوں صفحات پر جگہ جگہ ایسے پیراگراف یا جملے پڑھنے کو ملتے ہیں کہ ان کے مقابلے میں ماہرینِ اقبال یا شارحینِ اقبال کے مقالات اور تصانیف میں خودی کی توضیحات، توجیہات اور تعبیرات ماند پڑ جاتی ہیں۔ یاد رہے، اقبال کے ان مقالات کی اشاعت کے بعد بعض صورتوں میں دس سال بعض میں چار سال بعد "اسرارِ خودی" شائع ہوئی تھی۔

زیرِ نظر مضامین میں اقبال کا طریق کار یہ ہے کہ پہلے وہ عمرانی اہمیت کے مسائل پر نظری بحث کرتے ہیں۔ بعد میں عموماً ہندوستان کے مسلمانوں کے تمدنی حالات کا جائزہ لیتے ہیں۔ یہاں آغاز ہی میں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ اقبال کو ہندوستان کے مسلمانوں کا شاعر یا مفکر کہنے کے لیے معذرت خواہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس سے اقبال کی فکر قطعاً محدود نہیں ہوتی۔ اقبال کے مابعد الطبیعیاتی افکار تو بہرحال موضوع اور نوعیت کے اعتبار سے عالمگیر ہیں مگر ہندوستان کے مسلمانوں کے عمرانی مسائل پر جو ان کے ہاں اظہارِ خیال پایا جاتا ہے، ان کی نوعیت بھی اصل کے اعتبار سے عالمگیر ہے۔ کیونکہ دنیا کی ہر قوم کو ہمیشہ ان مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لہٰذا دنیا کا ہر مصلح، انقلابی قائد، سیاسی اور عمرانی مفکر اپنے زمانے کے معروضی حالات کی پیداوار ہوتا ہے۔ خود علامہ اقبال کے افکار اس دعوٰی کا بیّن ثبوت ہیں۔ کیا اقبال اس سے مختلف معروضی حالات میں انہی تمدنی امور کو اسی کیف و کم کے ساتھ اپنا موضوع بناتے؟ اقبال "قومی زندگی" میں جو ۱۹۰۴ء کی تصنیف ہے، ایک جگہ جدید زمانے کے انسان کی علمی فتوحات اور ایجادات کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

> "... یہ ہے وہ حیرت انگیز تغیّر جو زمانۂ حال کو زمانۂ ماضی سے ممیّز کرتا ہے اور جس کی حقیقت اس امر کی متقاضی ہے کہ تمام قومیں جدید روحانی اور جسمانی ضروریات کے پیدا ہو جانے کی وجہ سے اپنی زندگی کے لیے نئے سامان بہم پہنچائیں۔ میرا منشا یہ ہے کہ اس تغیّر کے لحاظ سے، اقوامِ ہندوستان اور خصوصاً مسلمانوں کی موجودہ حالت پر ایک نظر دوڑاؤں اور اس امر کو واضح کروں کہ زندگی کی کٹھن راہ میں ہمیں کون کونسی مشکلات درپیش ہیں اور ہمیں اس کے ازالہ کے لیے کیا کیا تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔"[۲۷]

اسی طرح "ملّتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر" میں نظری مباحث کو سمیٹتے ہوئے لکھتے ہیں:

"..... عالمِ اسلام میں جو واقعات اس وقت پیش آ رہے ہیں، وہ نہایت ہی معنی خیز ہیں اور ان پر تفحص کی نگاہ ڈالنا بہت کچھ سبق آموز ہو سکتا ہے لیکن یہ کام بے حد محنت طلب ہے اور میں اس کی انجام دہی سے قاصر ہوں، اس لیے میرا تبصرہ فقط مسلمانانِ ہند کے کارناموں سے متعلق ہوگا، اگرچہ اس موضوع پر بھی، ان مختلف مسائل کی نسبت جو ہمیں درپیش ہیں، میں شرح وبسط کے ساتھ رائے زنی نہ کر سکوں گا۔ میں صرف دو امور سے بحث کروں گا:

۱۔ تعلیم اور

۲۔ عامہ خلائق کی عام اصلاح"

متذکرہ دو امور سے بحث تقریباً بارہ صفحات پر محیط ہے۔ لیکن ان دو شقوں کے تحت اقبال نے جہانِ معنی سمو دیا ہے۔ شاید ہی عمرانی نوعیت اور اہمیت کا کوئی مسئلہ ہو جو زیرِ بحث نہ آیا ہو۔ اگر کوئی ان مسائل کی طرف نشاندہی کر دیتا تو وہی بڑا کارنامہ ہوتا مگر اقبال نے ان مسائل کا تجزیہ کرنے کے ساتھ ساتھ ترمیم و اصلاح کی تجاویز بھی پیش کی ہیں۔ یہاں ان میں سے چند مسائل پر مشتمل ایک فہرست مرتب کی جاتی ہے:

تعلیم کی ضرورت
مسلم نوجوان کی نئی نسل کا اسلوبِ زیست
مغربی تعلیم کے اثرات
اسلامی یونیورسٹی کا قیام اور اس کی نوعیت
تفرقہ آرائی
علما اور واعظ کا علمی معیار
عورتوں کی تعلیم
افلاس اور غریبوں کی ناگفتہ بہ حالت
اقتصادی آزادی کے لیے تجارت اور صنعت و حرفت کی ضرورت
علومِ جدیدہ کا حصول اور خصوصاً قدیم و جدید کی آمیزش۔

اس ضمن میں درجِ ذیل اقتباس ملاحظہ کیجیے۔ اقبال نے لکھا ہے کہ:

"میں اس حقیقت کے اعتراف کے لیے آمادہ ہوں کہ زمانۂ حال میں کسی جماعت کا محض مقامی قوتوں کے ذریعہ سے نشوونما پانا محال ہے۔ ریل اور تار نے زمان و مکان کے پردے کو درمیان سے اٹھا سا دیا ہے اور دنیا کی مختلف قومیں جن میں پہلے بعد المشرقین حائل تھا، اب پہلو بہ پہلو بیٹھی نظر آتی ہیں اور اس ہم نشینی کا نتیجہ یہ ہونے والا ہے کہ بعض قوموں کی حالت

> بدل کر رہ جائے گی اور بعض قومیں بالکل ملیا میٹ ہو جائیں گی، جو عظیم الشان اقتصادی، عمرانی اور سیاسی قوتیں اس وقت دنیا میں اپنا عمل کر رہی ہیں، ان کے نتائج کے بارے میں کوئی شخص پیش بندی کی راہ سے رائے زنی نہیں کر سکتا۔ لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ، گو کسی قوم کے لیے بغرضِ تکمیلِ صحت، اپنی تمدنی آب و ہوا کی تبدیلی کے طور پر کسی غیر قوم کے تمدن کے عناصر کا اخذ و جذب کرنا قرینِ مصلحت بلکہ لازمی ہی کیوں نہ ہو لیکن اگر اغیار کی تقلید میں شتابِ زندگی اور بے سلیقگی سے کام لیا گیا تو نظامِ قومی کے اعضاءِ رئیسہ میں اختلالِ عظیم پیدا ہونے کا خطرہ ہوگا۔"[69]

اس رائے سے اقبال کی صحتِ فکر، علمی دیانت اور عمرانی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ عمرانیات میں اقوام کے باہمی تعامل کے لیے اقبال نے ایسا معیار پیش کیا ہے جسے اگر پیشِ نظر رکھا جائے تو وہ اس ذہنی عذاب سے محفوظ ہو سکتی ہیں جس سے ترقی یافتہ اقوامِ غیر کی نامتوازن تقلید کی بنا پر ترقی پذیر قوموں کو بطورِ خاص گزرنا پڑتا ہے۔

یہ رائے اقبال کے فکر کی تفہیم کے لیے یوں بھی ضروری ہے کہ قومی بقا اور قومی ہستی کے بلا انقطاع تسلسل کا خیال اقبال کے فکر و شعر کی قوتِ محرکہ ہے۔ یہ تصور متذکرہ بیان سے بطورِ خاص نمایاں ہے۔

اقبال کی ابتدائی تحریروں میں جن خیالات کا اظہار ہوا ہے، ان کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر جاوید اقبال رقمطراز ہیں :

> "اقبال کی تحریروں کے مطالعہ سے عیاں ہے کہ وہ ابتدا ہی سے مسلم فرد اور معاشرہ کی تعمیرِ نو کے سلسلے میں بعض مخصوص خیالات رکھتے تھے۔ اسطرح شاعری کے مقصد کے بارے میں بھی ان کے اندازِ فکر میں کوئی الجھاؤ نہ تھا۔ اپنی حیات کے وسطی اور اختتامی ادوار میں اقبال انہی افکار کو زیادہ تفصیل کے ساتھ شعر و نثر میں پیش کرتے رہے۔ ...."[70]

نوٹ :

آخر میں ایک امر کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ زیرِ نظر مقالے میں "تذکراتِ فکرِ اقبال" کا مطالعہ شامل نہیں ہے کیونکہ اس کا مطالعہ ہم نے اپنے تحقیقی مقالہ "فکرِ اقبال کا عمرانی مطالعہ" کے ایک ذیلی باب بعنوان "تشکیلِ خودی کے عمرانی مقدمات" میں کیا ہے۔ (ادارہ)

حواشی

۱۔ دیکھیے راقم الحروف کا مضمون "اقبال کے دو ابتدائی مضمون"؛ مجلہ راوی لاہور۔ متوقع دسمبر ۱۹۸۹ء

۲۔ راقم الحروف کا مقالہ "علم الاقتصاد کا عمرانی مطالعہ"۔ سہ ماہی اقبال لاہور

۳۔ اقبال نامہ، حصہ دوم؛ مرتبہ شیخ عطاء اللہ۔ شائع کردہ شیخ محمد اشرف لاہور۔ ص ۳۵۸

۴۔ اس کا ترجمہ مولانا ظفر علی خاں نے "ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر" کے زیرِ عنوان کیا ہے۔

۵۔ مقالاتِ اقبال ۱۹۶۳ء۔ ص ۱۴۱۔۱۴۲

۶۔ ایضاً: ص ۱۴۳

۷۔ ایضاً: ص ۱۴۲

۸۔ ذوالفقار، ڈاکٹر غلام حسین، اقبال کا ذہنی ارتقا: مکتبہ خیابانِ ادب لاہور۔ جنوری ۱۹۷۸ء ص ۴۹

۹۔ اصل خطبہ انگریزی میں تھا اور اس کا اصل متن ۱۹۸۰ء تک نایاب رہا۔ (ڈاکٹر) رفیع الدین ہاشمی کو انگریزی متن دستیاب ہوا تو انہوں نے مجلہ تحقیق لاہور، جلد ۳، شمارہ ۱، میں شائع کروایا۔ خطبہ کا اصل عنوان Muslim Community (a sociological study 1910) ہے۔ "ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر" خطبہ کے ترجمہ کا عنوان ہے۔ ترجمہ مولانا ظفر علی خان نے کیا تھا۔

۱۰۔ مقالاتِ اقبال ۱۹۶۳ء۔ ص ۱۱۵

۱۱۔ ایضاً: ص ۴۶

۱۲۔ ایضاً: ص ۱۱۶

۱۳۔ ایضاً: ص ۵۱

۱۴۔ علم الاقتصاد، محولہ بالا: ص ۵۸

۱۵۔ مقالاتِ اقبال ۱۹۶۳ء: ص ۳۹

۱۶۔ بریفالٹ، رابرٹ، تشکیلِ انسانیت: ترجمہ عبدالمجید سالک، مجلس ترقی ادب لاہور۔ طبع دوم ۱۹۶۶ء ص ۵۴۹

۱۷۔ مقالاتِ اقبال ۱۹۶۳ء: ص ۱۱۸۔۱۱۹

۱۸۔ ایضاً: ص ۱۱۹

۱۹- مقالاتِ اقبال ۱۹۶۳ء: ص ۴۴-۴۵

۲۰- ایضاً: ص ۱۲۴

۲۱- Sherwani, Latif Ahmad, *Speeches. Writings and Statements of Iqbal* 1977, p. 87

۲۲-

۲۴- مقالاتِ اقبال ۱۹۶۳ء: ص ۴۵

۲۵- Sherwani, opt. cit., p. 100

۲۶- Sherwani, opt. cit. p. 100

۲۷- مقالاتِ اقبال ۱۹۶۲ء: ص ۱۲۳

۲۸- ایضاً: ص ۱۲۴-۱۲۵

۲۹- ایضاً: ص ۱۲۵

۳۰- ایضاً: ص ۴۴

۳۱- ایضاً: ص ۴۱

۳۲- Sherwani, opt. cit. p. 95

۳۳- ایضاً ص ۱۰۱-۱۰۲

۳۴- بشیر احمد ڈار (مرتب) انوارِ اقبال، اقبال اکادمی پاکستان کراچی، طبع اول مارچ ۱۹۶۷ء، ص ۴۳

۳۵- خلافتِ اسلامیہ، ظفر برادرس لاہور ۱۹۲۳ء۔ بحوالہ "تصانیفِ اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ" از

۳۶- ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی: اقبال اکادمی پاکستان لاہور ۱۹۸۲ء: ص ۴۱۴

۳۶- مقالاتِ اقبال ۱۹۶۲ء: ص ۸۹

۳۷- ایضاً: ص ۴۱

۳۸- ایضاً: ص ۱۳۰

۳۹- ایضاً: ص ۱۲۷

۴۰- زندہ رود (حیاتِ اقبال کا وسطی دور)، جاوید اقبال: شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور۔ اشاعتِ اول ۱۹۸۱ء ص ۱۹۸

IqbalCyberLibrary.net All rights reserved ©2003-2006